مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ ایک ''ترقی پسند'' مذہبی مفکر ایک جائزہ

ڈاکٹر حمیرا ناز☆

ABSTRACT

Molana Saeed Akber Abadi (1908-1985) was an eminent scholar, erudite author, and self styled critic of Sub continent- his educational and religious services were immense and enormous. He was one of the most distinguished personalities of the sub-continent due to his services to Islam. He benefited from renowned religious and worldly educational institutes and also taught there. Therefore he possessed great combination of traditional and modern values. He was among the some of enlightened, progressive and modern scholars of sub-continent. He believed to comprehend the demands of modern world and to shape Islamic teaching in accordance with it, so he thought Ijtihad as the need of modern time.

He kept casuistical and prophetic vision to find new venues in religion in changing world, that's why he embraced the way jurisprudence extensionism as his religious propensity. He rightly thought that the complex issues and variety of problems can not be

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، یونیورسٹی آف کراچی، کراچی

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IRI, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

addressed without jurisprudence extensionism, tolerance, and insisting on specific sect. that's why he adopted balanced, moderate and tolerant views in controversial and jurisprudential issues. This is the most significant aspect of his personality which inspires me most, and it is the topic of my present article.

برعظیم کے معروف اسکالر مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ دینی وعلمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، وہ اپنے علم وفضل، اخلاق و سیرت، جامعیتِ علم وفن اور تعلیمی وتحقیقی خدمات کے لحاظ سے قدیم اور جدید علمی حلقوں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک معلّم کی حیثیت سے ہندوستان اور یورپی ممالک کی درس گاہوں میں تدریسی اور انتظامی خدمات انجام دیں اور ایک عالم کی حیثیت سے اشاعتِ دین اور تبلیغ کا فریضہ بھی مختلف طریقوں سے انجام دیتے رہے۔ آپ کی علمی و دینی اور تدریسی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ انہوں نے قدیم و جدید دونوں طرح کی درس گاہوں سے اکتسابِ علم کیا[۱] اور اپنی علمی زندگی کا آغاز تدریس وتحقیق کے شعبے سے کیا۔وہ سینٹ اسٹیفن کالج (دہلی)، مدرسہ عالیہ کلکتہ، علی گڑھ یونیورسٹی اور کئی دیگر اداروں میں مدرس اور لیکچرر بھی رہے۔ انہوں نے ہندوستان کے علاوہ یورپ ومغرب کے اہم تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔[۲] اس دوران میں انہوں نے قرآن

۱- مولاناسعید احمد اکبر آبادی ایک طرف دار العلوم دیو بند سے وابستہ تھے تو دوسری طرف مولانا نے ذاتی طور پر انگریزی، حساب، جغرافیہ اور تاریخ کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔اور۱۹۳۴ میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی کے امتحانات پرائیویٹ دیے اور خود کو جدید تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے لیے دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ لے کر وہاں سے ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی طرح انہیں اُردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی زبان و ادب میں رسوخ اور رفتہ رفتہ تحریروتقریر میں عبور حاصل ہوگیا وہ ہندوستان کے اُن گنے چنے علماء میں سے تھے جنہیں اُردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی پر بھی عبور حاصل تھا۔جمیل مہدی، **نظرات**، مشمولہ:**بُرہان**، دہلی:ندوۃ المصنّفین، جلد ۹۵، شمارہ ۶ (جون ۱۹۸۵ء) ص۲

۲- مولانا کے علمی اور دینی کمالات کے اعتراف میں یورپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں نے انہیں وزیٹنگ پروفیسر کے اعزاز سے نوازا۔۱۹۶۲ء میں انہیں مک گل یونیورسٹی مونٹریل(کینیڈا) میں بحیثیت مہمان پروفیسر مدعو کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں کے علومِ شرقیہ کے حلقوں کو اپنے خیالات اور علمی موشگافیوں سے بھی متأثر کیا۔ ایضاً، ص۳-۴

و حدیث، سیرت النبیﷺ اور اسلامی تاریخ کو اپنی تحقیق و مطالعہ کا خصوصی موضوع بنا یا اور ان موضوعات پر ایک درجن سے زائد کتابیں[۳] اور سینکڑوں مقالات تحریر کئے جو ان کے علمی وفکری نظریات کا گرانقدر سرمایہ اور ان کے طرز نگارش کے بھی آئینہ دار ہیں۔علمی و تحقیقی کا وشوں کے حوالے سے مولانا کا دوسرا کارنامہ ندوۃ المصنفین (دہلی) کا قیام ہے۔ وہ اس کے نمائندہ رسالہ ماہنامہ بُرہان کے ۱۹۳۸ء سے اپنی وفات ۱۹۸۵ء تک تقریباً سینتالیس برس بطور مدیر فرائض بھی انجام دیتے رہے۔آپ ایک ممتاز ومعروف اہلِ قلم ہونے کے ساتھ ساتھ برعظیم کے ایک بلند پایہ مقرر اور خطیب بھی تھے۔آپ نے نہ صرف اسلامی اور بین الاقوامی اجتماعات میں شرکت کی بلکہ اپنے علمی مقالات اور فاضلانہ تقاریر سے اسلام کی نمائندگی اور ملّتِ اسلامیہ کی ترجمانی کا فریضہ بھی انتہائی خلوص اور دردمندی سے انجام دیا۔[۴] اس لحاظ سے وہ بلاشبہ ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے اور اپنی گوناگوں علمی خدمات کی وجہ سے برعظیم پاک و ہند کی چند نمایاں وممتاز شخصیات میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔[۵]

زیرِ نظر مقالے میں مولانا کی شخصیت کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے جو فی الحقیقت انتہائی توجہ کا مستحق ہے اور جس کے اثرات آپ کی تحریروں میں واضح نظر آتے ہیں۔یہ پہلو آپ کی مذہبی اُمور و مسائل میں اعتدال پسندی اور وسیع النظری ہے۔آپ کا شمار برعظیم کے اُن روشن خیال اور ترقی پسند علماء میں ہوتا ہے جو ہمیشہ نئی باتوں کو اپناتے اور نئی قدروں کا احترام کرتے تھے۔ اسی لیے ہر حلقہ انہیں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، خواہ اس کا تعلق کسی بھی سیاسی و دینی مسلک سے کیوں نہ ہو[۶] اگر چہ وہ دیوبند کے فاضل تھے اور آخر دم تک اسی سے وابستہ رہے۔ تاہم مدرسہ دیوبند سے متعلق ہونے اور حنفی فقہ سے منسلک

۳- آپ نے دینی، تاریخی، ادبی، تنقیدی اور سیاسی موضوعات پر جو بلند پایہ علمی وتحقیقی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں اُن میں الرق فی الاسلام، **غلامانِ اسلام، فہم قرآن، وحی الٰہی، مسلمانوں کا عروج و زوال، صدیق اکبرؓ، ہندوستان کی شرعی حیثیت، چار علمی مقالات، عثمان ذوالنورینؓ، مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد، مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم۔ سیرت وشخصیت اور علمی اورعملی کارنامے، علمائے ہند کا سیاسی موقف اور خطباتِ اقبال پر ایک نظر** بہت مشہور ہیں۔

۴- صلاح الدین یوسف، **مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم علمی تبحر، اعتدال اورفقہی توسُّع کی حامل شخصیت**، مشمولہ: **برہان**، جلد ۹۹، شمارہ ۶، (جون ۱۹۸۷ء)، ص ۳۴۴

۵۔ ایضاً، ص ۳۴۴-۳۴۵

۶- منظر شہزاد، **''سعید احمد اکبرآبادی جیسے روشن خیال کبھی نہیں ہوتے''**، روزنامہ جنگ، کراچی (۲۷ جون ۱۹۸۶ء)، ص ۱۱

ہو نے کے باوجودآپ کی شخصیت کے اندر توسع کا پہلو نما یاں ہے۔ انہوں نے اپنے نظریات میں اُس سختی سے احتراز کیا جو علمائے دیو بند کا خاصہ رہی ہے۔ وہ مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کے درمیان اختلافات کےحل کے حوالے سے معتدل، نرم خو اور متوازن فکر کے حامل مشہور تھے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہؒ کی فکر کے اثرات کےتحت عالمِ اسلام کےمختلف منجمد فرقوں میں تقسیم کے خلاف آواز اٹھائی اور عالمِ اسلام کے پیچیدہ مسائل کےحل کے لیے تمام فقہی مکاتب سے استفادہ پر زور دیا۔(۷) آپ نے نہ صرف فقہی توسُّع کو بطور مسلک اپنا یا بلکہ ایک جگہ اس کا بر ملا اظہار بھی فرمایا۔ چنانچہ وہ بنگلور (جنوبی ہند) کی ایک کانفرنس کی روداد لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’میں نےمسلم معاشرے میں پائے جانے والے رجحانات کا ذکر کیا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ رجحانات تین قسم کی ہوتے ہیں:

۱- قدامت پرستی (Orthodoxy)

۲- ترقی پسندی (Progressiveness)

۳-آزادفکری (Liberalism)

۱- اوّل الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ زمانے کا خواہ کوئی مسئلہ یا کوئی معاملہ ہو، بہرحال اس کا حل کسی ایک فقہی مسلک کی روشنی میں تلاش کیا جائے، اور سرِ مو اس سے انحراف روا نہ رکھا جائے۔

۲- اس کے بالمقابل ترقی پسندی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اصل قانون قرآن و حدیث میں ہے اور فقہی مسالک کی حیثیت اس قانون کی تشریح و توضیح کی ہے، وہ بجائے خود قانون نہیں ہے۔ اس بناء پر کسی جدید مسئلے کا حل اولاً براہِ راست قرآن و حدیث میں دیکھنا چاہیے اور اس کے بعد فقہ سے وہی کام لینا چاہیے جو عدالت میں بحث کرتے وقت ایک وکیل نظائر سے لیتا ہے۔

۳- اب رہا تیسرا رجحان، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف قرآن کو مآخذ تسلیم کرتا ہے اور حدیث کو حجت نہیں مانتا، پھر اپنے لیے قرآن کی آزاد اور بے قید و بند تفسیر و توضیح کا حق بھی مانتا ہے۔ میں

۷۔ عبد العلی، *"Professor Akbarabadi: Some Distinctive Features of His Religious Thought and Personality"* مشمولہ: **مولانا سعید احمد اکبرآبادی احوال وآثار** (مرتبہ) محمد سعود عالم قاسمی، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، شعبہ سنی دینیات (۲۰۰۵ء) ص ۳

نے کہا کہ میرا تعلق دوسرے طبقے سے ہے اور یہی رجحان میرے نزدیک صحیح ہے''۔[۸]

اسی طرح ایک اور موقع پر مولانا نے اپنے مذہبی طرزِ فکر کی وضاحت اس طرح کی ہے:

> راقم الحروف کا قصور اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دیو بند کا فیض یافتہ، جمیعت العلماء کا ممبر اور قدر دان ضرور ہے، لیکن اپنے دل و دماغ کو ہمیشہ کھلا اور آزاد رکھتا ہے اور کبھی کسی مسئلہ پر جماعتی عصبیت اور تحزب کے ساتھ غور نہیں کرتا، اس بناء پر دار العلوم دیو بند ہو یا ندوہ، جمیعت علماء ہو یا اسلامی جماعت، تبلیغی جماعت ہو یا دینی کونسل ان سب اداروں کے اکابر اور کارکنوں کے خلوص، علم و فضل اور اسلامی حمیت و جوش کا دل سے معترف اور قدر دان ہے اور یہ جماعتیں جو کام کر رہی ہیں ان کی اہمیت و افادیت کا منکر نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان جماعتوں کی کسی رائے، کسی طریقِ کار اور یا کسی نظریے سے بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔ ایمانداری سے اختلاف ہر انسان کا قدرتی حق ہے اور اُسے یہ حق استعمال کرنا چاہیے۔ معاشرے کی شعوری صلاح و فلاح اسی پر موقوف ہے۔ پھر میں جس طرح کسی جماعت کو بھی تنقید سے بالا نہیں سمجھتا، اسی طرح کسی شخصِ واحد کو بھی، خواہ وہ دنیا کا کتنا ہی بڑا امام اور شیخِ وقت ہو، تنقید سے ماورا نہیں مانتا، مگر ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہوں کہ ارادت و عقیدت، ادب و احترام اور تنقید و اختلاف ان کے حدود کیا ہیں اور ان حدود میں رہ کر کس طرح ایک شخص دونوں کے مقتضیات و مطالبات سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔[۹]

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا خیال تھا کہ مسلمانانِ ہند کو چند قانونی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور اس

۸- سعید احمد اکبر آبادی، **بنگلور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر**، مشمولہ: **برہان**، جلد ۵۹، شمارہ ۴ (اکتوبر ۱۹۶۷ء) ص ۲۱۳

۹- ایضاً، **نظرات**، مشمولہ: **بُرہان**، جلد ۴۹، شمارہ ۵ (نومبر ۱۹۶۲ء) ص ۲۶۰

کی واحد راستہ اجتہاد ہے۔ وہ اجتہاد کو دورِ حاضر کی ضرورت سمجھتے تھے۔[۱۰] اُن میں نئے حالات کے مطابق دین کی نئی راہیں پیدا کرنے کا احساس و شعور اور مجتہدانہ بصیرت موجود تھی۔ اس خوبی نے انہیں اہلِ علم کے حلقوں میں مقبول بنا دیا تھا۔ ایک جگہ انہوں نے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ:

> دین اسلام دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا دین اور دوسرا شریعت۔ دین کا تعلق بنیادی اُصول وضوابط سے ہے گوکہ دین کی تشریحات مختلف پیغمبروں نے اپنی اپنی شریعت کے مطابق کیں اور اس کی تکمیل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے ہوئی۔ دین بنیادی طور پر حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک ایک ہی رہا۔ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے اس میں وہ قوانین وضوابط ہوتے ہیں جن کا دارو مدار دین پر ہوتا ہے، گوکہ عملی اعتبار سے دین و شریعت کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تاہم شریعت میں تھوڑی سے لچک اور نرمی ہوتی ہے تاکہ کسی خاص قوم کی ضرورت اور زمانے کے تقاضے کے مطابق ضروری قوانین وضوابط بنائے جا سکیں اور ہر دور کی ضرورت کے مطابق اس میں مناسب ترامیم کی جا سکیں۔ لہٰذا حضورِ اکرم ﷺ کے وصال کے بعد حالات کی تبدیلی کے ساتھ جو نئے نئے مسائل در پیش ہوں گے جن کی وجہ سے قرآن و سنت کی روشنی میں نئے ضوابط بنائے جائیں گے اور پرانے قوانین میں تبدیلی کی جائے گی۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر اجتہاد کے بغیر چارہ کار نہیں۔ اسی میں اپنی رائے سے کام لینا اجتہادِ شرعی کہلاتا ہے۔[۱۱]

اسی لیے مولانا نے اسلامی شریعت کو متحرک اور حالات کے مطابق ڈھل جانے والا قرار دیا جس میں ہر دور اور ہر مقام کے لحاظ سے اُصول اخذ کیے جا سکتے ہیں۔مثال کے طور پر اس سوال کے جواب میں کہ ہندوستان کو دارالاسلام سمجھا جائے یا دار الکفر ۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ دور کے مختلف فقہی مباحث کی تقسیم کے لیے دارالاسلام اور دار الکفر کی پرانی فقہی تقسیم غیر عملی اور غیر ضروری ہے۔ دنیا کا حالیہ سیاسی نظام، جمہوریت، قومیت اور شہریت کے حوالے سے نئے تصورات اس تقسیم کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔[۱۲] آپ

۱۰- ایضاً، **دور جدید میں اسلامی قانون**، مشمولہ: **بُرہان**، جلد ۸۷، شمارہ ۳ (ستمبر ۱۹۸۱ء)، ص ۵۳۷

۱۱- ایضاً، ص ۵۳۵

۱۲- ایضاً، جلد ۸۷، شمارہ ۴، (اکتوبر ۱۹۸۱ء) ص ۲۰۹

نے ایک معتدل اور ترقی پسند مسلم مفکر کی طرح نہ صرف بعض متنازعہ مسائل کے حل پیش کیے بلکہ انہوں نے اپنے ہم عصر علماء پر زور دیا کہ وہ عصرِ حاضر کے مسائل کے حل کے لیے اپنے ذہن و نظر کو وسیع رکھیں۔ چنانچہ ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ :

> دورِ حاضر کے معاشرتی اور سیاسی نظام کے زیرِ اثر انسانی تہذیب ایک جدید دور میں داخل ہوئی ہے اس لیے علماء پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ جدید مسائل کے اسلامی حل کے حوالے سے مستعد اور فعال کردار ادا کریں۔ نیز ان مسائل پر کھلے ذہن کے ساتھ غور و فکر کرنے کے بعد قرآن و حدیث، اسلامی فقہ اور قوانینِ اسلام کی تاریخ کی روشنی میں ان کا حل تجویز کریں۔ اس طرح کر کے وہ اسلام اور مسلمانو ں کی عظیم خدمت انجام دیں گے۔ (۱۳)

چنانچہ ہم یہاں پر بطورِ مثال آپ کے اسی مسلک، فقہی توسع، اعتدال پسندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے موجودہ دور کے مسلمانوں کے چند اہم متنازعہ مسائل پر روشنی ڈالیں گے، جن کے حل کے لیے آپ نے مختلف مسالک کے فقہی فیصلوں کو بلا تکلف تسلیم کیا اور حنفی فقہ کو نظر انداز کر دیا۔

طلاق

طلاق مباحات میں سے ایک ایسا مباح عمل ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے حلال چیزوں میں سب سے زیادہ نا پسندیدہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں مسلم معاشرے کے کچھ غیر محتاط افراد کے طرزِ عمل سے مسلم معاشرتی نظام کو زبردست نقصان پہنچ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سی بے گناہ اور مظلوم عورتوں کو سخت پریشانی اور کلفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مولانا اکبر آبادی نے بھی اس مسئلے پر اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔ آپ طلاق کے مسئلے پر اہلِ حدیث مکتبہ فکر سے متفق تھے کہ ایک نشست میں جتنی دفعہ بھی طلاق دی جائے، اسے ایک ہی تصور کیا جائے گا۔ اس معاملے میں انہوں نے واضح حنفی فقہی اُصول کو چھوڑ کر اہلِ حدیث مسلک اور امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے نقطۂ نظر کو ترجیح دی۔ آپ کا کہنا تھا کہ ایک نشست میں جتنی دفعہ بھی طلاق کا لفظ کہا جائے گا اسے ایک ہی تصور کیا جائے گا تاکہ حلالہ جیسی مذموم معاشرتی خرابیوں سے بچا

۱۳- ***Some Distinctive Features of His Religious Thought and Personality***
حوالہ سابقہ، ص ۵

جاسکے۔(۱۴)

دارالحرب میں مسلمانوں کا کافروں سے سود لینا:

فقہ حنفی کا ایک مشہور مسئلہ ہے کہ دارالحرب میں مسلمانوں کا کافروں سے سود لینا جائز ہے۔ مولانا اکبر آبادی ۱۹۶۴ء میں مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی کانفرنس میں تشریف لے گئے اور وہاں کے علمی مباحث میں حصّہ لیا جس کی مختصر رُوداد انہوں نے ماہنامہ ''بُرہان'' دہلی میں خود اپنے قلم سے لکھی تھی۔ اس کانفرنس میں بنک کے سود پر گرما گرم بحث ہوئی۔ اس میں شیخ ابوزہرہ مرحوم نے سود کی حرمت پر بڑی زوردار تقریریں کیں،لیکن شیخ نے فقہ حنفی کا مذکورہ مسئلہ بھی اپنی ایک تقریر میں ضمنی طور پر بیان فرمادیا اور کہا کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک حربی اور مسلم معاملہ میں ربوٰا نہیں ہے یعنی وہ جائز ہے۔(۱۵) مولانا اکبرآبادی نے اس کے جواب میں ایک مختصر تقریر کی اور فرمایا کہ اگر امام صاحب کی طرف اس کا انتساب صحیح ہے تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ جب قرآن میں وحَرَّم الرِّبٰوا عام اور مطلق ہے تو کسی نص یا حدیثِ متواتر کے بغیر اس کی تخصیص اور تقلید کس طرح جائز اور درست ہوسکتی ہے؟ مزید وضاحت کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ائمہ اور فقہا اس بات میں اختلاف کرسکتے ہیں کہ فلاں معاملہ ربٰوا کے تحت آتا ہے یا نہیں؟ لیکن اگر کسی معاملے کی نسبت یہ ثابت ہوجائے کہ ربٰوا کی تعریف اس پر صادق آتی ہے تو اب دنیا میں کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ معاملہ جائز ہے۔(۱۶)

بنک کا سود

بنک کا سود اُن چند مسائل میں سے ایک ہے جن پر علماء اسلام نے کافی بحث کی ہے۔ جبکہ مولانا کا کہنا ہے کہ یہ بھی بہت آسان مسئلہ ہے۔ ''بیع'' اور ''ربٰوا'' دو ایسے الفاظ ہیں جن پر قرآن نے مالی لین دین کے سلسلے میں اپنے صاف صاف احکامات دیے ہیں۔ اوّل الذکر حلال چیز ہے جبکہ دوسری چیز (یعنی ربٰوا) حرام ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے لین دین بھی ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے ربٰوا میں شمار فرمایا ہے اس وجہ

۱۴- **مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم علمی تبحر، اعتدال اور فقہی توسّع کی حامل شخصیت**، حوالہ سابقہ، ص ۳۴۵-۳۴۶

۱۵- سعید احمد اکبر آبادی، **قاہرہ میں مجمع البحوث الاسلامیہ کی دوسری سالانہ کانفرنس**، مشمولہ: **بُرہان**، جلد ۵۵، شمارہ ۲ (اگست ۱۹۶۵ء)، ص ۱۷۷

۱۶- ایضاً

سے وہ بھی حرام ہیں۔ اس کے مقابلے میں کچھ ایسے مالی لین دین ہیں جن کو رسول ﷺ نے ''بیع'' میں شمار فرمایا ہے اس لیے وہ حلال ہیں۔(۱۷) مولانا کا کہنا ہے کہ اگر کوئی ان دونوں قسم کے مالی معاملات کا جن کا رسول اللہ ﷺ نے ذکر کیا ہے بنظر غائر مطالعہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ ربٰوا کا حقیقی مطلب ناجائز طور پر اقتصادی فائدہ حاصل کرنا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی غربت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اپنے ذاتی مفادات اور قساوت کو سامنے رکھ کر نیز دوسرے کی خوشحالی یا تنگدستی سے قطع نظر کرکے بہت زیادہ امیر بن جاتا ہے۔ لہٰذا مولانا کا کہنا ہے کہ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد پھر موجودہ بنکاری نظام کا بغور جائزہ لینا ہوگا۔ اس کے بعد یہ طے کرنا ہوگا کہ بنک کا انٹرسٹ (سود) حقیقی معنوں میں قرآن میں مذکور "ربٰوا" کے تحت آتا ہے یا نہیں اور اگر آتا ہے تو پھر یہ مکمل ''ربٰوا'' ہے یا جزوی ''ربٰوا''، یا یہ کہ یہ مضاربت اور شرکت کی ہی کوئی قسم ہے۔ مضاربت وہ تجارتی معاملہ ہے جس کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔(۱۸) اس کی روشنی میں مولانا کا کہنا ہے بہرحال یہ وہ راستہ ہے جس کو ایک مجتہد اختیار کرنے کے بعد کوئی نتیجہ نکال سکتا ہے اور وہ اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل تلاش کرسکتا ہے۔(۱۹) سودی بینک کاری کے موضوع پر مولانا نے یہ رائے تقریباً تیس سال قبل پیش کی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب اسلامی دنیا میں بینک کاری کی اسلامائزیشن کا بڑا چرچا تھا اور آج بھی یہ موضوع انتہائی توجہ کا حامل ہے تاہم مولانا نے اس موضوع پر ایک اُصولی موقف اختیار کیا ہے اور اپنا کوئی فیصلہ مسلط کرنے کے بجائے اسلامی اُصول و قوائد کی روشنی میں اس علم وفن کے ماہرین کو فیصلے کا اختیار دے دیا ہے۔

انشورنس (بیمہ)

مولانا کی رائے ہے کہ انشورنس (بیمہ) بھی مسائل کی مندرجہ بالاقسم میں شمار ہوتی ہے۔ اس پر عرب دنیا کے مشہور عالم شام کے شیخ مصطفیٰ اور مصر کے شیخ ابوزہرہ کے درمیان کافی گرماگرم بحث ہوئی ہے۔ شیخ مصطفیٰ نے اپنی کتاب الثامین میں انشورنس (بیمہ) کو جائز قرار دیا ہے۔ جبکہ ابوزہرہ نے اس کا انکار کیا ہے اور اس کے ناجائز ہونے کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ اس کی روشنی میں مولانا فرماتے ہیں کہ پوری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ آیا انشورنس (بیمہ) ربٰوا کی تعریف میں داخل ہوتی ہے اور اس کی ہی ایک قسم

۱۷- ایضاً، **دورِ جدید میں اسلامی قانون**، حوالہ سابقہ، جلد ۸۷، شمارہ ۴ (اکتوبر ۱۹۸۱ء)، ص۵۹۴-۵۹۵

۱۸- ایضاً

۱۹- ایضاً

ہے یا نہیں۔[۲۰] یہ ایک مجتہد کو دیکھنا ہوگا۔[۲۱]

ہندوستان دارالکفر ہے یا دارالاسلام

عمومی رائے یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ملک دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ دارالحرب ہوگا یا دارالاسلام۔ انگریزی عہد کے ہندوستان اور آزاد ہندوستان کے دارالاسلام اور دارالحرب ہونے سے متعلق علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ علماء کی ایک بڑی تعداد نے اسے دارالحرب قرار دیا جو آج بھی اسی حالت پر برقرار ہے۔ جب کہ کچھ علماء نے اسے دارالاسلام ہی مانا ہے۔[۲۲] لیکن مولانا اکبرآبادی اس تقسیم سے اتفاق نہیں کرتے۔اس سلسلے میں آپ کا کہنا ہے کہ دنیا کے موجودہ سیاسی اور سماجی نظام نے جس کی وجہ سے انسانی تہذیب و تمدن کے ایک نئے دور نے جنم لیا ہے، علماء کو مجبور کیا ہے کہ وہ اس مسئلے پر ازسرنو غور کریں اور قدیم فقہا کے نظریات کا جائزہ لیں جس طرح کہ پہلے ایک غیرمسلم ریاست کو دارالہجرت کہا جاتا تھااور فقہا نے دنیا کو دو قسموں میں منقسم کیا تھا (i) مسلم ریاست اور (ii) غیرمسلم ریاست۔ مسلم ریاست کو دارالاسلام اور غیرمسلم ریاست کو دارالہجرت کہا تھا۔[۲۳] لیکن اب مولانا کے خیال میں مندرجہ بالاتقسیم موجودہ حالات میں منطبق نہیں ہوتی۔ کیونکہ مختلف ممالک کا موجودہ سیاسی ڈھانچہ، جمہوری نظریات اور ان پر عمل، بنیادی شہری حقوق اور کسی ملک میں رہنے والے کو وطنی (شہری) حقوق کا حاصل ہونا وغیرہ ایسےنظریات ہیں جو عالمی طور پر قبول کیے جاچکے ہیں اورمسلم و غیرمسلم تقریباً تمام ممالک میں اس پر عمل درآمد ہورہا ہے۔ اس وجہ سے مندرجہ بالاتقسیم کے اعتبار سےمسلم و غیرمسلم ممالک میں حد فاصل قائم کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے اور مذہبی اعتبار سے اس کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔[۲۴] تاہم اس موضوع کا ایک وہ پہلو بھی ہے جومسلم سیاسی

۲۰- ایضاً

۲۱- مولاناسعید احمد اکبرآبادی کا دینی وعلمی مسائل و امور پر کلام کا ایک طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ وہ ہرمسئلے پر عام مفتیوں کی طرح فتویٰ صادر کرنے کو پسندنہیں کرتے بلکہ مسئلے کی نشاندہی کرکےغور وفکر کا سامان مہیا کرتے ہیں چنانچہ مولانا اکبر آبادی نے موجودہ دور کےمسلمانوں کے چند اہم مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے بارے میں فرمایا کہ: وہ اس جگہ ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں نہ کہ ایک حکم (جج) کی حیثیت سے کسی مسئلے میں فتویٰ دینا میرا کام نہیں۔ یہاں پرصرف جستجو اور مذاکرہ ہی مقصد ہے۔ ایضاً، ص ۵۸۸

۲۲- محمد شمیم اختر قاسمی، **ہندوستان کی شرعی حیثیت: مولانا اکبرآبادی کی نظر میں**، مشمولہ: **مولانا سعید احمد اکبرآبادی احوال و آثار** (مرتبہ) محمد سعود عالم قاسمی، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، شعبہ سنی دینیات (۲۰۰۵ء)، ص۲۰۶

۲۳- **دورِجدید میں اسلامی قانون**، حوالہ سابقہ، جلد ۸۷، شمارہ ۴(اکتوبر ۱۹۸۱ء)، ص ۲۰۹

۲۴- ایضاً

مفکرین، اسلامی اور غیر اسلامی ریاست کی نوعیت اور مقاصد کے ضمن میں کرتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ بحث قدیم ہے مگر موضوع کے اساسی فکروفلسفہ کے اعتبار سے اسلامی اور غیر اسلامی ریاست کی نوعیت اور مقاصد کو نظرانداز نہیں کیاجاسکتا ہے۔

مغربی ممالک میں گوشت کا مسئلہ

جو مسلمان یورپ و امریکہ وغیرہ جاتے ہیں۔ اُن کو اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہاں ان ممالک میں ایک خاص انداز سے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قسم کا ذبیحہ اسلام کے نزدیک جائز ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں مولانا کا کہنا ہے کہ اس سوال کا جواب دوباتوں پر غور کرنے کے بعد ہی سامنے آسکے گا۔

۱- جانور اللہ کے نام کے بغیر ذبح کیا جائے۔

۲- ذبح کرنے کا طریقہ مشینی ہے جو اسلام کے ذریعہ تسلیم شدہ طریقہ سے بالکل مختلف ہے۔

پہلی بات کے سلسلے میں مولانا نے امام ابوحنیفہ کی رائے نقل کی جن کے نزدیک اللہ کا نام لیے بغیر جانور کا ذبح کرنا قطعاً ناجائز ہے اور اپنی اس دلیل کے لیے امام ابوحنیفہ نے قرآن کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ نقل کی ہے کہ ''اور جس جانور پر (ذبح کرتے وقت) اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے اس کو مت کھاؤ اور اس کا کھانا فسق ہے'' (الانعام:۱۲۱)۔[۲۵] پھر آپ نے اس کے بالمقابل امام شافعی کا قول نقل کیا ہے۔ اُن کے نزدیک صرف اُس جانور کا گوشت کھانا حرام ہے جس کو اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔ جب کہ وہ جانور جس کے ذبح کرتے وقت کسی کا نام نہ لیا گیا ہو، نہ اللہ کا نہ کسی دوسرے کا اس کو کھانا اُن کے نزدیک جائز ہے۔[۲۶] امام شافعی نے اس مسئلے پر کئی قرآنی آیات کو بطور دلیل پیش کیا ہے[۲۷] کہ صرف ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے جس کو ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ جس

۲۵- ایضاً، ص۶۰۵

۲۶- ایضاً

۲۷- **سورۃ البقرہ: ۱۷۳** اور **سورۃ الانعام: ۱۴۵** کی کچھ آیات میں اس کا حکم دیا گیا ہے کہ جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ اُن میں ایک آیت مندرجہ آیت **سورۃ الانعام: ۱۲۱** ہے جس میں 'وانــه لفسـق' کے الفاظ ہیں یعنی ایسے گوشت کا کھانا فسق ہے جبکہ انہی الفاظ (وانــه لفسـق) کے ساتھ سورۃ الانعام : ۱۴۵ بھی ہے جس میں ایسے جانور کا گوشت کھانا فسق بتایا گیا ہے جس کو اللہ کے نام کے علاوہ کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا گیا ہو کیونکہ دونوں جگہ فسق کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے اس لیے امام شافعی کہتے ہیں کہ صرف اُن جانوروں کا گوشت کھانا جن پر اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا نام لیا گیا ہو حرام ہے۔ایضاً، ص۶۰۶

کے نتیجے میں باقی دوصورتوں میں گوشت حلال رہے گا۔[۲۸] اس مسئلے پر مولانا اکبرآبادی نے امام شافعی کے قول کی تائید کی ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے آپ کا کہنا ہے کہ جہاں تک پہلے معاملے کا تعلق ہے، یورپ و امریکہ میں ذبح کیے گئے جانور کا گوشت حرام نہیں رہے گا۔[۲۹] جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے اس ضمن میں آپ کا فرمانا ہے کہ علماء کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اسلام کی پوری تاریخ میں اب تک مسلمان جس طریقے سے جانور کو ذبح کرتے چلے آرہے ہیں، وہ کیا مذہبی اقدار میں سے کوئی قدر ہے یا محض رسم و رواج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس کی حیثیت صرف رسم و رواج کی ہے اور اس کے پیچھے قرآن کی صریح دلیل نہیں ہے تو ایک دوسرا بہتر اور زیادہ ترقی یافتہ طریقہ اپنانے سے شرعی حدود کی خلاف ورزی نہیں سمجھی جائے گی۔[۳۰] یہ صحیح ہے کہ مولانا نے ذبح کے طریقہ میں ایک لچکدار طریقہ اختیار کیا ہے تاہم اُس طریقہ کو بھی شریعت سے مشروط کردیا ہے۔

عورتوں کی عوامی سرگرمیوں میں شرکت

مولانا اکبرآبادی نے جدید علمی و سائنسی ترقی کی دوڑ میں خواتین کی شمولیت و شرکت کی حمایت کی ہے اور اس کی توجیہہ بھی پیش کی ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ مسلم عورتیں ماضی میں الگ تھلگ زندگی گزارتی رہی ہیں، چاہے پردہ ہو یا نہ ہو۔ اسے ماضی میں کتنا ہی اچھا کیوں سمجھا جاتا رہا ہو، موجودہ حالات میں مسلمانوں کا اس سے گریز ان کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایک ایسے دور میں جب تمام اقوام ترقی کے میدان میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں شریک ہوں اس قوم کے لیے ترقی ممکن نہیں ہے جس کی آدھی آبادی مرکزی دھارے سے کٹ جائے۔ تعلیم، طب (میڈیسن) اور کسی حد تک قانون (فقہ) ایسے میدان ہیں جن میں ہماری بہنیں اور بیٹیاں شرکت کرسکتی ہیں۔ ان میدانوں میں شرکت نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی ہے اور اسلامی قانون میں پسندیدہ بھی ہے۔[۳۱] تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا شاید درست نہ ہوگا کہ مولانا عورتوں کی مادرپدر آزادی اور مخلوط اجتماع کے حامی ہیں۔[۳۲]

۲۸- ایضاً

۲۹- ایضاً

۳۰- ایضاً

۳۱- ایضاً، ص ۶۰۴ - ۶۰۵

۳۲- اس کے لیے مولانا اکبرآبادی کا یہ مضمون ملاحظہ ہو:

خواتین اسلام، مشمولہ: **بُرہان**، دہلی، جلد ۹۱، شمارہ ۳ (اکتوبر ۱۹۸۳ء)، ص ۲۴۲ تا ۲۴۸

جمع بین الصلاتین

جس وقت مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرض الموت میں علیل ہوکر بستر تک محدود ہوگئے تھے تو آپ نے نمازوں میں حنفی فقہ کے برخلاف امام ابن تیمیہ کا اتباع کیا اورجمع بین الصلاتین کا اہتمام کیا۔ یعنی آپ نے اہلِ حدیث کے مسلک کے مطابق دو نمازوں کو ایک وقت میں ادا کیا۔ یہ واقعہ مولانا کے فقہی توسُّع اور اعتدال پسندی کا ایک اور مظہر ہے۔[۳۳]

تعدد ازدواج

مولانا اکبر آبادی نے تعددِ ازدواج کے مسئلے پر بھی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں گفتگو فرمائی ہے۔ اس مسئلے پر آپ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تعددِ ازدواج کی اجازت صرف بطور رعایت دی گئی ہے کیونکہ آپ کے نزدیک اُس وقت کے حالات کے تحت ایسا کرنا ضروری تھا۔[۳۴] لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ یہ مدنظر رہے کہ یک زوجگی (ایک وقت میں ایک بیوی رکھنے کے اُصول) کی اجازت قرآنی نقطۂ نظر سے عام ہے جبکہ تعدد ازواج کی اجازت صرف بطو ررعایت دی گئی ہے۔ اس کے لیے مولانا سورۃ الانساء: ۳ کی آیت بیان کرتے

۳۳- محمد اسلم، **وفیات۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی رحلت،** مشمولہ: معارف، اعظم گڑھ : دار المصنّفین، جلد ۱۳۵، شمارہ ٦ (جون ۱۹۸۵ء)، ص ۴٦۲

۳۴۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی امیرعلی کی کتاب ، **دی اسپرٹ آف اسلام** کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اسلام سے قبل نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سے دوسرے ممالک میں بھی تعددِ ازواج پر عمل کیا جاتا تھا۔ کیونکہ:

۱- اسلام سے قبل لوگ عام طور پر حالتِ جنگ میں رہتے تھے۔مسلسل جنگ و پیکار کی وجہ سے آدمیوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں کہیں کم تھی۔ عورتوں کے سر پرستوں اور نگہداشت کرنے والوں کی کمی کی وجہ سے ان کو خستہ حالی اورمحتاجگی کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے تعدد ازدواج کو زیادہ فروغ ہوا۔

۲- اسلام کو ابتدائی تاریخ میں ان ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ مسلمان اپنے دشمن سے جو کہ اُن کو مٹانے پر تلا ہوا تھا، ان سے مستقل حالتِ جنگ میں رہے۔ عورتیں اپنے محبوب شوہروں سے اور بچے اپنے پیارے والدوں سے محروم ہوگئے، اسلام کو ان مسکین اور یتیموں کی مشکلات کا حل تلاش کرنا پڑا۔

۳- ان ہنگامی حالات کی وجہ سے ہی اسلام کو اس بات کی اجازت دینی پڑی کہ ایک آدمی ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے۔ ہنگامی حالات اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کے تھے۔ مثلاً کسی عورت کا کوئی ایسا جسمانی نقص جس کی وجہ سے وہ اپنے شوہر کی جنسی خواہشات پوری نہ کر سکے یا وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہے۔**دورِ جدید میں اسلامی قانون**، حوالہ سابقہ جلد ۸۷، شمارہ ۴ (اکتوبر ۱۹۸۱ء)، ص ۵۸۸- ۵۸۹

ہیں،جس میں تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ہے۔(۳۵) لیکن مولانا واضح کرتے ہیں کہ تعددِ ازدواج کی مندرجہ بالا اجازت بھی غیر مشروط نہیں ہے۔ اس میں بھی عدل و مساوات کی شرط ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے تعددِ ازدواج کی اجازت کا غلط طریقے پر استعمال کیے جانے کی طرف بھی نشاندہی کی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ تعددِ ازدواج کا شمار احکامات کی ایک خاص قسم یعنی مباحات میں ہوتا ہے۔ اس طرح دوسرے مباحات کی طرح تعداد ازواج میں جہاں کہیں خوبیاں ہیں وہاں افراط و تفریط کی وجہ سے اس کا غلط استعمال بھی ہوسکتا ہے اور اگر ایسے حالات پیداہوجائیں جب کسی مباح کو ذاتی اغراض پورا کرنے کی وجہ سے غلط استعمال کیا جانے لگے اور اس کی وجہ سے اخلاقی و معاشرتی اقدار متأثر ہوتی ہوں تو اسلامی اسٹیٹ یا مسلمانوں (کے نظم اجتماعی) کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے اور اس کو عارضی طور پر روک دے یا کچھ پابندیاں عائد کردے جیسا کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے بہت سے فیصلوں سے اس نقطۂ نظر کو مزید تقویت ملتی ہے۔(۳۶)

اس گفتگو کی روشنی میں جو چند اہم نکات سامنے آئے ہیں، مولانا جس کی طرف ایک مجتہد کی توجہ مبذول کراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان نکات کو سامنے رکھ کر ایک مجتہد ایک نتیجہ نکال سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعددِ ازواج کی شرعاً اجازت ہے لیکن اس مسئلے کی اباحت کے سلسلے میں اسلام کی عائد کردہ کچھ قیود وپابندیاں ہیں۔ دنیا میں انسانوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد، دیگر معاشی اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے اسلامی اسٹیٹ یا اُس کی غیر موجودگی میں خود مسلمان اگر ایسا مناسب سمجھتے ہوں تو اس عمل پر کچھ پابندیاں

۳۵- اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ترجمہ: ''اور اگر تم کو ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں کا حق برابر نہ دے سکو گے تو (دوسری غیر) جو عورتیں تم کو بھلی لگیں اُن سے نکاح کرلو دو دو، تین تین، چار چار (یعنی دو سے لے کر چار تک) پھر اگر تم کو (کئی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے میں) ڈر ہو کہ برابر انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی پر قناعت کرو یا لونڈی پر۔ یہ ظلم سے بچنے کی زیادہ نزدیک راہ ہے۔ ایضاً، ص ۵۸۹-۵۹۰

۳۶- اس سے متعلق مولانا اکبر آبادی حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ مسلمان اہل کتاب عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا۔ کہ یہ عمل معاشرے میں بہت عام (مقبول) ہوتا جارہا ہے، تو انہوں نے یہ فرمایا: گو کہ مجھے کسی حلال چیز کو حرام یا حرام چیز کو حلال کرنے کا اختیار نہیں ہے لیکن مجھے اس کی ضرور فکر ہے تم اگر رومی لڑکیوں کی خوبصورتی پر اس طرح ریجھتے رہے۔ تو عرب کی کنواری لڑکیوں کا کیا حال بنے گا۔ لہٰذا حضرت عمرؓ نے اس مباح کو عارضی طور پر روک دیا۔ ایضاً، ص ۵۹۵- ۵۹۱

عائد کرسکتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ سے اخلاقی اور معاشرتی اقدار متأثر نہ ہوں۔(۳۷)

فیملی پلاننگ

فیملی پلاننگ یا سادہ الفاظ میں برتھ کنٹرول (ضبطِ تولید) اُن مسائل میں سے ہے جن پر گرما گرم بحثیں اور پُرزور دلائل کے ساتھ مذاکرات ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس مسئلے پر بھی گفتگو کی ہے۔ آپ کا فرمانا ہے کہ یہ مسئلہ بہت آسان ہے اور اتنا پیچیدہ اور مشکل نہیں ہے جتنا کہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے آپ کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ اسلام میں شادی کا مقصد صرف جنسی خواہشات کو (جائز طریقہ سے) پورا کرنا ہی نہیں جو کہ اپنی جگہ بہت ضروری ہے۔ بلکہ انسانی آبادیوں کی نشوونما اور اس کی تعداد میں اضافہ بھی ہے۔ اسی لیے برتھ کنٹرول(ضبط تولید) کی عام حالات میں اجازت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن ایک فطری مذہب ہونے کی حیثیت سے اسلام واقعی صورتِ حال اور زندگی کے اُن حقائق سے جو کسی قوم کو درپیش ہوں کنارہ کشی اختیار کرکے آنکھیں بند نہیں کرسکتا۔ آپ کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں جو روایات بیان ہوئی ہیں، ان میں باہم تناقض ہے۔ عرب میں برتھ کنٹرول (ضبط تولید) کے لیے عام طور پر عزل کے طریقے پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ احادیث میں عزل کے سلسلے میں ممانعت آئی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف بخاری میں حضرت جابرؓ نے ایک روایت میں فرمایا کہ ''ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عزل کرتے اور وحی (بشکل قرآن) نازل ہوتی تھی۔''(۳۸) اس کی روشنی میں مولانا نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں کہ (i) برتھ کنٹرول (ضبطِ تولید) کی اجازت بغیر کسی معقول عذر کے نہیں دی جاسکتی لیکن کسی حقیقی اور معقول وجہ سے برتھ کنٹرول (ضبطِ تولید) کی اجازت نہ صرف دی جاسکتی ہے بلکہ کبھی کبھی یہ عمل ضروری بھی ہوجاتا ہے۔ البتہ محض اغراضِ نفسانیہ کو پورا کرنے اور دل بہلانے کے مقصد سے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔(۳۹)

اس ضمن میں مولانا دو چیزوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ (i) پہلے یہ کہ یہ شوہر و بیوی کے درمیان ذاتی و نجی معاملہ ہے اور اس سلسلے میں وہ (شرعی حدود کے اندر) مناسب تدابیر اختیار کرنے کے مجاز ہیں۔ اسلام کے مطابق کسی گورنمنٹ کو اس میں مداخلت کا اختیار نہیں ہے۔(ii) دوسرے یہ کہ برتھ کنٹرول

۳۷- ایضاً، ص ۵۹۱

۳۸- ایضاً، ص ۵۹۳

۳۹- ایضاً

(ضبطِ تولید) کے سلسلے میں استعمال کی گئی تدبیرصحت کے لیے کم سے کم مضر ہونا چاہیے۔[۴۰]

خواتین کا پردہ

پردہ نسواں کے حوالے سے آپ نے اپنا یہ نقطہ نظر پیش کیا ہے کہ چہرہ اگرچہ ستر میں داخل نہیں لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ کشفِ وجہ مطلقاً جائز ہو، کیونکہ یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔ موقع محل کے اعتبار سے اس کے احکام تبدل پذیر ہیں۔[۴۱] اگرچہ مولانا اکبرآبادی پردہ نسواں کو ایک معاشرتی مسئلہ کہتے ہیں لیکن یہ مسئلہ کس حد تک معاشرتی ہے اور کس حد تک دینی، آپ نے اس کی بحث سے گریز کیا ہے تاہم مولانا یہ بھی فرماتے ہیں کہ حج کے سلسلے میں شریعت کا صاف حکم ہے کہ عورت کا احرام ہی چہرہ کھلا رکھنا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض خواتین برقع کی ٹوپی میں ایک چھجا لگالیتی اور اس سے نقاب لٹکالیتی ہیں تاکہ چہرہ بھی کھلا رہے اور کوئی اسے دیکھ بھی نہ پائے۔ مولانا کے نزدیک اس قسم کی رسم پرستی دینداری ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ سرتاسر اتباع ہوا اور **اعجاب کل ذی رأی برأیه** (ہر رائے دینے والا اپنی بات کو اہمیت دے) ہے جس پر شدید وعید خداوندی ہے۔[۴۲] پردہ نسواں سے متعلق مولانا کا مؤقف اگرچہ خاصا لچکدار ہے اور ایک معاشرتی و تمدنی مسئلہ کے طور پر اسلامی اور مغربی ممالک میں حساس تنازعہ کی صورت بھی اختیار کرچکاہے تاہم مولانا کشفِ وجہ کو مطلقعاً جائز قرار نہ دے کر بالواسطہ طور پر چہرہ کے پردہ کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

گائے کی قربانی

گائے کی قربانی کا مسئلہ ہندوستان میں ہمیشہ سے دو بڑی قوموں مسلمانوں اور ہندوؤں میں کشیدگی اور کشاکش کا سبب بنا رہا ہے۔ ملک کی تقسیم جن حالات میں ہوئی ہے ان کی وجہ سے اس کی نزاکت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ چونکہ یہ خالص مذہبی معاملہ ہے اس لیے مولانا اکبرآبادی سمجھتے ہیں کہ یہ علماء کا فرض تھا کہ تقسیم کے بعد ہی فوراً اس کے متعلق کوئی متفقہ فیصلہ کرکے مسلمانوں کی رہنمائی کرتے تاکہ گومگو کے عالم میں رہنے کے باعث جان و مال کا جو خسارہ مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑرہا ہے اس سے نجات ملتی اور صورتِ حال کا کوئی خوشگوار حل نکل سکتا۔ چنانچہ مولانا اکبرآبادی نے علماء کی اس خاموشی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

۴۰- ایضاً، ص ۵۹۴

۴۱- ایضاً، **نظرات**، حوالہ سابقہ، جلد ۸۵، شمارہ ۱ (جولائی ۱۹۸۵ء)، ص ۸۰

۴۲- ایضاً

کیونکہ آپ کے نزدیک اگر اب بھی اس کا کوئی حل نہ نکالا گیا تو اس کے نتائج انتہائی خطرناک اور افسوسناک ہوں گے۔ چنانچہ اس مسئلہ کی نزاکت کے پیشِ نظر آپ اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جہاں تک اس مسئلے کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ گائے کی قربانی نہ فرض ہے اور نہ واجب بلکہ مباح ہے، جس میں اخذ اور ترک کرنے اور نہ کرنے دونوں کا اختیار ہوتا ہے۔ پھر اس میں شبہ نہیں کہ کبھی خارجی اور بیرونی حالات کے باعث کسی امر مباح کا کرنا واجب بھی ہوجاتا ہے اور کبھی ممنوع بھی اور ان حالات کی تشخیص و تعیین اگر مسلمانوں کی حکومت ہو تو حکومت کا کام ہے اور وہ بھی علما کے مشورے سے ورنہ یہ صرف علماء کا کام ہے۔[۴۳]

آپ مسلمانوں کو اس مسئلہ پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے قطع نظر کہ موجودہ حالات میں ہندوؤں کی پوزیشن کیا ہے اور مسلمانوں کی کیا، نفسِ مسئلہ کی حیثیت سے اس پر غور کرنا چاہیے کہ (i) گاؤ کشی سببِ نزاع ہے یا نہیں؟ (ii) اگر سبب نزاع ہے تو کیا مسلمان اس کی مقاومت کرسکتے ہیں؟ (iii) اگر مقاومت نہیں کرسکتے تو کیا ازروئے احکامِ اسلام مسلمان اس سبب نزاع کو دفع وختم کرسکتے ہیں؟[۴۴] ان تین سوالوں کے پیشِ نظر آپ کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں گاؤکشی آج سے نہیں ہمیشہ سے سبب ِنزاع بنی رہی ہے۔ لیکن تقسیمِ ہند سے قبل چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی طاقت متوازن تھی اس لیے مسلمان اس کی مقاومت کرسکتے تھے۔ تقسیم کے بعد صورتِ حال یہ ہے کہ اس کا سببِ نزاع ہونا تو شدید سے شدید تر ہوگیا ہے اور دوسری جانب مسلمانوں میں تابِ مقاومت نام کو بھی نہیں رہی ہے۔ اس بناء پر آپ کا کہنا ہے کہ اب سوچنا یہ ہوگا کہ مسلمان باختیار خود اس کو ترک کرسکتے ہیں یا نہیں؟ تو شریعت کہتی ہے کہ ہاں مسلمان اس کو ترک کرسکتے ہیں اب لامحالہ شریعت کا حکم یہ ہی ہوگا کہ اجتماعی طور پر اس کے ترک کردینے کا اعلان کردینا چاہیے۔[۴۵] لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی گروہ مسلمانوں سے پوچھے بغیر اس حکم کو مسلمانوں پر زبردستی نافذ کرے اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کے جذبے سے تو ان مسلمانوں کے لیے اس کا حکم دوسرا ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کے لیے ممکن ہے تو اس کی مقاومت کرنی چاہیے ورنہ جبر

۴۳- ایضاً، جلد بست و پنجم، شمارہ ۴ (اکتوبر ۱۹۵۰ء)، ص ۵

۴۴- ایضاً، جلد بست و پنجم، شمارہ ۶ (دسمبر ۱۹۵۰ء)، ص ۳۲۴

۴۵- ایضاً

تو بہر حال ہوگا ہی۔(۴۶)

انسدادِ گاؤ کشی اور تعددِ ازدواج مداخلت فی الدین ہے یا نہیں

اس حوالے سے مولانا کہ کہنا ہے کہ اگرچہ تعددِ ازدواج اور گاؤ خوری دونوں کی حیثیت یکساں ہے، دونوں اسلام میں نہ فرض ہیں اور نہ واجب، بلکہ مباح ہیں۔ اگر حکومت ان دونوں کی بندش سے متعلق کوئی قانون بناتی ہے تو گاؤ خوری کی بندش مداخلت فی الدین ہرگز نہیں۔ لیکن تعددِ ازدواج کی بندش مداخلت فی الدین ہوگا۔(۴۷) آپ اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس پر مباح کا لفظ بولا جائے تو اس کی ممانعت کو مداخلت نہیں کہا جاسکتا ورنہ آپ اس دنیا میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے اور اپنی اصلاح و ترقی کے لیے کوئی قانون نہیں بناسکتے۔ اس لیے جو چیزیں فقہی اصطلاح میں مباح کہلاتی ہیں وہ دوقسم کی ہیں۔ ایک وہ جن سے کسی قسم کی کوئی مصلحتِ دینی وابستہ نہیں ہے اور ان سے قربت کا کوئی تعلق نہیں اور دوسری قسم ان چیزوں کی ہے جن کے مباح ہونے سے شریعت کی کسی بنیادی اغراض اور مقصد کی تکمیل میں مدد ملتی ہے۔ اور اس بناء پر اس پر نتیجتاً عذاب و ثواب کا ترتب ہوتا ہے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ اس میں قربت کے معنی پنہاں ہیں۔(۴۸) اس کی روشنی میں مولانا کا کہنا ہے کہ گاؤ خوری پہلی قسم کے مباحات میں داخل ہے کیونکہ اس کا حکم نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔اس حوالے سے آپ علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب ''الرحمة فی الطب والحکمة''(ص ۸) سے آنحضرتﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آنحضرتﷺ نے فرمایا کہ ''گائے کا گوشت داء یعنی بیماری اور اس کا دودھ اور گھی شفا ہے۔''(۴۹) اس کی روشنی میں مولانا کہتے ہیں کہ اگر حضور صلیﷺ کی طرف سے اس قول کی نسبت صحیح ہے تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس معاملہ میں جانبِ نفی ہی قابلِ ترجیح ہوگی۔ لہٰذا آپ کا کہنا ہے بہرحال گاؤ خوری پہلی قسم کا مباح ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی بندش مداخلت فی الدین نہیں ہے۔(۵۰)

جبکہ تعددِازدواج کے معاملے میں مولانا کا کہنا ہے کہ یہ مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے اگرچہ فقہی طور

۴۶- ایضاً، جلد ۴۷، شمارہ ۴ (اپریل ۱۹۷۵ء)، ص ۱۹۸

۴۷- ایضاً، جلد ۵۸، شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۶۷ء)، ص ۳

۴۸- ایضاً، ص ۲-۳

۴۹- ایضاً، ص ۳

۵۰- ایضاً

پر اس پر بھی اطلاق لفظ مباح کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ مباح کی دوسری قسم میں شامل ہے اور اس کی اباحت ایک اہم دینی مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے[۵۱] چنانچہ اس بناء پر آپ کا کہنا ہے کہ کوئی شبہ نہیں اسلام کا یہ قانون خاص خاص حالات میں پاکبازی اور صحتِ دل و دماغ اور آسودگی نظر کا کفیل وضامن ہے۔ اب اگر کوئی حکومت خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، ایسا قانون بناتی ہے جس کے ماتحت مسلمان اس اباحت سے فائدہ نہیں اٹھاسکتے تو اس کا حل بجز اس کے کچھ نہ ہوگا کہ مسلمان ان سہولتوں سے محروم ہوجائیں گے جو ایک امر جنسی کی حالت میں اطمینان وسکون اور پاکبازی کی زندگی بسر کرنے کے لیے اُن کے دین نے فراہم کی ہیں۔ لہٰذا آپ کا کہنا ہے یہی حقیقت ہے مداخلت فی الدین کی، تعددِ ازدواج کی اجازت قرآن میں مطلق نہیں بلکہ مشروط ہے۔ لہٰذا اس بناء پر ایک اسٹیٹ کو اس بات کی نگرانی کرنے کا تو حق ہے کہ وہ شرط پوری ہورہی ہے یا نہیں؟ لیکن تعددِ ازدواج کو بالکل ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا۔[۵۲]

رؤیتِ ہلال:

رؤیت ہلال ایک خالص دینی مسئلہ ہے جس کا تعلق مسلمانوں کی عبادات سے ہے تاہم رؤیتِ ہلال کے

۵۱- مولانا کہتے ہیں فرض کیجئے ایک شخص ہے جس کی بیوی بانجھ ہے اور اُس کو اولاد کی تمنا ہے جو ہر شخص کو طبعی طور پر ہوتی ہے یا وہ بیمار ہے اور اس کی بیماری لا علاج ہے یا اس کے اور بیوی کے مزاج میں اتحاد اور موافقت نہیں ہے، جس کے باعث اُس کی زندگی اجیرن بنی ہوئی ہے اور وہ درد وکرب کی زندگی گزر رہا ہے؟ اب سوچئے ان حالات میں بدنصیب شوہر کیا کرئے؟ اگر اس بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کر لے تو اس کی انسانیت، شرافت، اور غیرت گوارہ نہیں کر سکتی کہ جو عورت اتنے زمانے تک اُس کی رفیقہ زندگی بنی رہی ہے اُ س کو یوں ایک ایسے امر کے باعث جس میں عورت کو کوئی دخل نہیں خانہ بدر کرکے روٹیوں کا محتاج بنا دے۔ اس بناء پر اب اس شخص کے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہیں یا انسانیت اور شرافت کو بالائے طاق رکھ کراس بیوی کو طلاق دے اور دوسری شادی کرلے اور یا بہر صورت اسی ایک بیوی پر قانع رہ کر عمر پر اسی آگ میں جلتا رہے۔ اسلام میں تعدد ازدواج کی اباحت کا قانون اس شخص کی مدد کرتا ہے اور ایک ایسی درمیانی صورت پیدا کردیتا ہے کہ پہلی بیوی بے سہارا اور بے یار و مددگار نہیں ہوتی اور خود اس کی اپنی زندگی بھی اجیرن نہیں ہوتی اور حقیقت یہ ہے کہ اس شخص کی مصیبت اور مشکل کا حل اس سے بہتر کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ اب اگر قانون اس شخص کو عقدِ ثانی سے روکتا ہے تو اس کے معنی بالواسطہ یہ ہیں کہ یہ شخص ہر ہمچاری ہو کر رہے جو ایک تندرست انسان کے لیے قطعاً غیر طبعی فعل ہے اور یا شہد کی مکھی بن کر زندگی کے دن گزارے کہ ہر روز ایک نیا آستاں، نیا سنگِ در اور نئی جبین نیاز/ ایضاً، ص ۳-۴

۵۲- ایضاً، ص ۴

موضوع پر بحث وتمحیص ایک روایت بن گئی ہےخصوصاً پاکستان میں ہر سال رمضان اورعید الفطر کے موقع پر رؤیتِ ہلال کامعاملہ شدت اختیار کرلیتاہے۔ اس مسئلے پر مولانا اکبر آبادی نے بھی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ آپ اپنی گفتگو کا آغاز امام ابو حنیفہؒ کی اس مسئلے پر رائےنقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک امام ابوحنیفہ کی رائے یہی ہے کہ رؤیت ہلال میں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں لیکن اس سے یہ مراد لینا کہ دنیا کے کسی حصّہ میں بھی رؤیت ثابت ہوجائے تو ساری دنیا میں اس کے مطابق عمل ہوگا اور ہر جگہ رؤیت تسلیم کی جائے گی،آپ کے نزدیک یہ ایک ایسی ناقابلِ فہم اور لغو بات ہے جسے کم ازکم موجودہ زمانہ کا کوئی پڑھا لکھا آدمی تسلیم نہیں کرسکتا۔ پھر امام عالی مقام کااس قول سے یہ مطلب کس طرح ہوسکتا ہے۔ (لوگوں نے امام صاحب کا مطلب غلط سمجھا ہے) اس بناء پر آپ کا کہنا ہے کہ اصل میں دیکھنا یہ چاہیے کہ شریعت کاحقیقی منشاء اور اس سلسلہ میں ارشاد نبویﷺ کیا ہے اور اس کی روح کیا ہے۔[۵۳] اس نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بعد مولانا دو باتیں بیان کرتے ہیں:

۱- اوّل یہ کہ روزہ اور اس کے افطار کا دارومدارصرف رؤیت ہلال پر ہوگا،شمسی حساب یا کسی اور حساب پر ہرگز نہیں ہوگا۔

۲- رؤیت دوقسم کی ہے:

  ۱- حسی اور ظاہری

  ۲- معنوی اور معہود[۵۴]

اس کی روشنی میں مولانا کا کہنا ہے کہ ظاہری رؤیت تو کھلی ہوئی رؤیت ہے۔ اس کے متعلق کسی بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں۔ البتہ معنوی رؤیت کے معنی یہ ہیں کہ طول البلد اور عرض البلد کے حساب سے کسی ایک مقام پر بھی خواہ ان میں مسافت اور بُعد کتنا ہی ہو، رؤیت ہونی چاہیے۔مگر کسی سبب سے نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں آپ آنحضرتﷺ کا مشہور ارشادنقل کرتے ہیں"**صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غم علیکم فاقدروا له**"ترجمہ: چاند دیکھ کر روزہ رکھا کرو اور چاند دیکھ کر عید منایا کرو اگر مطلع ابر آلود ہوتو اندازہ کرلیا کرو۔اس حوالے سے عبداللہ بن عباسؓ سے جو روایت مروی ہے اس کے بارے میں مولانا کا کہنا ہے

۵۳- ایضاً، جلد ٦٦، شمارہ ٦ (جون ۱۹۷۱ء)، ص ۳٦٦

۵۴- ایضاً، ص ۳٦٦- ۳٦۷

کہ اس میں بجائے ''فاقدروا له'' کے فاکملوا العدة ثلاثين (یعنی اگر مطلع ابر آلود ہوتو تیس کی گنتی پوری کرلیا کرو) کے الفاظ ہیں۔علماء نے ان دونوں میں تضاد سمجھا ہے۔[۵۵] جبکہ آپ کا کہنا ہے کہ ہمارے نزدیک دونوں قول صحیح ہیں اور ان کا محمل الگ الگ ہے۔ یعنی اگر فضا ابر آلود ہے اور کہیں سے رؤیت کی خبرنہیں آئی ہے تو تیس دن پورے کرلینے چاہئیں۔لیکن اگر کہیں سے خبر آگئی ہے تو تم حساب لگا کر دیکھو کہ یہاں چاند ہوسکتا تھا یانہیں! اگر حساب سے معلوم ہو کہ مقامِ رؤیت سے عرض البلد میں اشتراک یا قرب کے باعث یہاں بھی رؤیت متحقق ہوسکتی تھی تو بس اب صرف خبر کے متعلق تحقیق کرلو کہ وہ کیسی ہے؟ اگر عرف عام میں اس طرح کی خبر کو سچا سمجھا جاتا ہے تو زیادہ کج و کاد کی ضرورت نہیں،اس خبر کی بنیاد پر تم بھی رؤیت تسلیم کرلو۔ ایسی صورت میں آپ کے نزدیک ٹیلی فون اور ریڈیو کی خبر کا اعتبار چند شرائط کے ساتھ ہونا چاہیے۔لیکن جس مقام پر رؤیت نہیں ہوئی ہے تو آپ کا کہنا ہے کہ اس مقام پر ازروئے حساب چاند کا مرئی ہوسکنا ایک امرقطعی ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس کی روشنی میں مولانا کے نزدیک اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ساری دنیا میں ایک ہی دن رمضان یا عید کرنے کا جذبہ شریعت میں ہرگز ناقابلِ عمل ہے اور نہ مستحسن! بلکہ یہ ایک ایسی بدعت ہے جس سے اسلام بَری ہے۔ اس بناء پر آپ کا کہنا ہے کہ جن دو ملکوں میں غروب آفتاب کا فصل تین چار گھنٹہ ہو ان میں ایک کی رؤیت دوسرے کے لیے کس طرح حجت بن سکتی ہے۔[۵۶]

جمعہ تعطیل

مولانا سعید احمد اکبر آبادی جمعہ کی تعطیل کے بجائے اتوار کی تعطیل میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں سمجھتے۔ آپ کے اس نقطۂ نظر کا اظہار نظرات کی اس تحریر سے ہوتا ہے جو آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے وائس چانسلر کے ایک سرکلر کی تائید میں کہی ہے کہ آئندہ جمعہ کے بجائے اتوار کوتعطیل ہوگی۔ مولانا اس سرکلر کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اتوار کی چھٹی میں قابلِ اعتراض بات کیا ہے؟ ایک ایسا ادارہ جس کو اُن سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے روزمرہ واسطہ پڑتا ہو، جہاں تعطیل کا دن اتوار ہو، اس کے لیے تعلیمی اور انتظامی سہولت اسی میں ہے کہ اس کے ہاں بھی تعطیل کا دن اتوار ہی ہو۔ رہی جمعہ کی تعطیل تو اس کا حکم نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو قرآن کی سورۂ جمعہ میں نماز جمعہ سے متعلق جو آیات

۵۵- ایضاً،ص ۳۶۷

۵۶- ایضاً،ص ۳۶۷-۳۶۸

ہیں ان سے تو بطور دلالۃ النص یہ ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن تعطیل ہونی ہی نہیں چاہیے۔ آپ اپنی بات کے استدلال میں سورۂ جمعہ کی آیت:۹ کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اے ایمان والو! جب نماز جمعہ کے لیے اذان ہوجائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید وفروخت (یعنی کاروبار) چھوڑ دو'' مولانا کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان سے قبل تک کا کاروبار کی اجازت تھی اور مسلمان کرتے بھی تھے پھر جب نماز ختم ہوجائے تو اب ارشاد ہے کہ تم اپنے اپنے کاروبار پر پہنچ جاؤ اور کسب معاش کرو۔ [۵۷] مولانا کہتے ہیں اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد بھی صرف اجازت نہیں بلکہ حکم ہے کہ اپنے اپنے دھندے سے جا کر لگو۔ لہٰذا جمعہ کے بجائے اتوار کو تعطیل کرنے میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں۔ [۵۸]

غیر مسلم تقریبات

ہندوستان میں غیر مسلم تقریبات میں شرکت کے حوالے سے مسلمانوں کا جو عام ذہن اور اندازِ فکر بن گیا تھا یعنی کسی معاملے کے متعلق اس کے مختلف پہلوؤں کے تجزیہ و تحلیل کے بغیر ایک عام اور مطلق حکم لگادینا۔ اس کا مظاہرہ اس مسئلے پر بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک فریق اس کو مطلقاً ناجائز کہتا ہے اور دوسرا جائز۔ چنانچہ اس مسئلے کے پیشِ نظر مولانا اکبر آبادی اس کی اصل حقیقت یہ بیان کرتے ہیں کہ تقریب مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی، اس کی دو حقیقتیں ہوتی ہیں، ایک مذہبی اور دوسری سوشل۔ [۵۹] اس کی روشنی میں مولانا کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں جو احکام پیدا ہوتے ہیں وہ چار قسم کے ہیں:

۱۔ تقریبات کی نوعیت اگر خالص مذہبی ہے تو اس میں شریک ہونا اور عبادت میں عملی حصّہ لینا قطعاً حرام ہے۔

۲۔ اس نوعیت کی تقریبات میں صرف شریک ہونا اور عبادت یا پوجا پاٹ میں عملی حصّہ نہ لینا اس کی دو قسمیں ہیں:

۵۷- ایضاً، جلد ۵۹، شمارہ ۵ (نومبر ۱۹۶۷ء)، ص ۲۵۹

۵۸- ایضاً

۵۹- مولانا کا کہنا ہے کہ مثلاً مسلمان عید مناتے ہیں تو اُس کی حیثیت تو یہ ہے کہ نماز پڑھتے ہیں تو یہ مذہبی ہے اور دوسری یہ ہے کہ تحفہ تحائف بھیجتے ہیں، دعوتیں کرتے ہیں۔ مبارکباد کے خطوط بھیجتے ہیں اور عید یونین پارٹیاں کرتے ہیں۔ بس یہی حل غیر مسلم تقریبات کا ہے۔ ایضاً، جلد ۵۸، شمارہ ۲ (فروری ۱۹۶۷ء) ص ۶۷

(الف) کسی تحقیق یا معلومات حاصل کرنے کی نیت سے شریک ہونا۔

(ب) اس طرح کی کسی نیت اور ارادہ کے بغیر محض تماشائی کی حیثیت سے شریک ہونا۔[۶۰]

اس کی روشنی میں مولانا کا کہنا ہے کہ ان دونوں میں (ا) کا حکم یہ ہے کہ مباح ہے اور (ب) کا حکم یہ ہے کہ مکروہ ہے۔

۳- اب رہی تیسری قسم یعنی یہ کہ تقریب کی نوعیت مذہبی اور عبادتی نہیں بلکہ سوشل عصرانہ یا ڈنر وغیرہ کی صورت میں یا کلچرل ہے۔ یا ایک ایسے جلسہ کی صورت میں ہے جس میں اکابرِ مذہب کے حالاتِ زندگی اور ان کے علمی اور اخلاقی کمالات پر تقریریں کی جائیں تو اس نوع کی تقریبات میں شریک ہونا صرف جائز نہیں بلکہ مستحب ہے۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں اور غیرمسلمانوں کے تعلقات خوشگوار ہوتے ہیں اور محبت بڑھتی ہے۔ اسلام میں جس طرح مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی خوشگواری مطلوب ہے، اسی طرح مسلمانوں اور غیرمسلموں کے باہمی علائق و روابط کی خوشگواری اور حسنِ معاشرت مرغوب ہے۔[۶۱]

موجودہ زمانے کے مذکورہ بالا مسائل جن کے حل کے لیے مولانا نے فقہ اسلامی کی روشنی میں جو چند تجاویز پیش کیں، اس سے مولانا کا یہ نقطہ نظر سامنے آتا ہے کہ فقہ اسلامی ایک جامد، بے حرکت و غیرمتحرک قانون نہیں ہے بلکہ متحرک اور تغیر پسند، قانون ہے جو پوری قوت اور اعتماد و بھروسہ کے ساتھ کسی بھی دور کے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، خصوصاً دورِ حاضر میں جبکہ زمانے نے ایک نئی کروٹ لی ہے اور ہمارا معاشرہ ناگزیر اقتصادی و سیاسی اور معاشرتی عوامل کی بناء پر ایک عجیب وغریب روپ میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے بعض مسائل از سرِ نو فکر وعقل کی سطح پر ابھر آئے ہیں اور اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کی جانچ پڑتال کر کے شریعتِ اسلامی میں ان کو صحیح جگہ متعین کیا جائے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مطالبہ یہ ہو رہا ہے کہ فقہ کی ساری ترتیب ہی بدل دی جائے اور اس کو جدید ترین شکل میں پیش کیا جائے۔ فقہ کی نئی تدوین پر زور دینا در اصل اس بات پر زور دینا ہے کہ معاشرے کے موجودہ ڈھانچے کا جائزہ لیا جائے، جس کے کئی اجزاء بالکل فرسودہ ہو چکے ہیں اور موجودہ تقاضوں کے قریب ہو کر

۶۰- ایضاً

۶۱۔ ایضاً

دیکھا جائے کہ ان میں کتنا وزن ہے۔ کیا چیزیں ان میں اپنانے اور سمو لینے کی ہیں اور کتنی ایسی ہیں جن کو چھونا بھی جائز نہیں۔ کیونکہ یہی جائزہ اور احتساب حیاتِ ملّی کا واحد ضامن ہے۔[۶۲] لہٰذا درحقیقت آج ہمیں اجتہاد کی جس قدر ضرورت ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور یہ ضرورت و اہمیت تاریخ کے ہر دور میں محسوس کی گئی ہے۔ تاہم اجتہاد کا مسئلہ ایک نازک مسئلہ ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ دین میں اجتہاد پر گفتگو کرنا ہر خاص و عام کا موضوع بن گیا ہے۔ خواہ وہ عوام ہوں یا خواص، علماء ہوں یا اسکالرز، ہر محفل و مجلس کا یہی موضوع سخن ہے اور ہر ایک اسی موضوع پر اپنی رائے زنی اور اپنے مخصوص نظریہ کے مطابق اس کی تشریح و توضیح کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق جس قدر گفتگو زیادہ ہوتی ہے معاملہ اسی قدر پیچیدہ ہو جاتا ہے اور نفسِ موضوع کی وضاحت و تشریح رہ جاتی ہے اور اجتہاد کو عوام کے لیے ایک کھلی چھوٹ سمجھ لیا گیا ہے تاکہ وہ خدا کے دین میں اپنی من گھڑت باتیں کہہ سکیں اور شرعی اُمور میں اپنی من مانی رائے ظاہر کریں اور دین میں وہ چیز داخل کر دیں جس سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو اور وہ چیز خارج کر دیں جو شارع اسلام پر نازل ہوئی ہے اور جس پر امت کا عمل رہا ہے اور یہ سب کچھ اجتہاد، تجدد اور تقاضائے زمانہ کی تقلید و اتباع میں کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب ہم ایک دوسرے نقطہ نظر کو دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنا الگ موقف ہی بنا لیا ہے جس کے سامنے نہ موجودہ دنیا کے حالات و مسائل ہیں اور نہ ہی اسلامی قانون کی لچک اور تغیر پذیر صورت ہے اور جو شریعت کو صرف دسویں صدی ہجری کی زبان و اصطلاح میں سمجھتی ہے اور اس کو جامد و معطل شکل میں پیش کرتی ہے، جس میں اجتہاد و توسُّع کی قطعی طور پر کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ ان کی فہم و فراست کی آخری حد اور ان کا مبلغ علم فتویٰ کی بعض کتابوں اور چند فقہی نصوص سے زیادہ نہیں ہوتا، چنانچہ ان کے نزدیک تفقُّہ کا مطلب یہ ہے کہ فقہ کی سمجھ اور متأخرین کی آراء سے واقفیت حاصل ہو جائے، انہیں اس سے مطلب نہیں کہ فقہ کا اصل سرچشمہ کیا ہے۔ یہ دونوں نظریے ایک دوسرے کے ردعمل کا نتیجہ ہیں یہی وجہ ہے کہ عرصہ دراز سے ان دونوں انتہا پسند طبقوں کے درمیان بُعد بڑھتا گیا جو اب تک برابر قائم ہے اور علماء ان دونوں طبقوں میں بٹے ہیں۔[۶۳] تاہم ان دونوں کے مدِّ مقابل ایک جماعت ترقی پسند علماء کی بھی ہے جو حالات و تقاضے کی روشنی میں قدیم چیزوں کی نئی ترتیب و تہذیب چاہتی ہے اور جو اس حقیقت سے واقف ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو معقول المعنی ہے اور ایسی فقہی بنیادوں پر

۶۲- محمد حنیف ندوی، **مسئلہ اجتہاد**، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء ص ۲۰۹-۲۱۰

۶۳- عبدالمبین ندوی، (مترجم) **دورِ حاضر میں اجتہاد اجماعی**، مشمولہ: **بُرہان**، جلد ۹۶، شمارہ ۳ (مارچ ۱۹۸۶ء) ۵۱ تا ۵۳

استوار ہے کہ جن پر ہر دور اور ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق نئی نئی عمارتیں قائم کی جا سکتی ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں ماضی میں بھی محدثین اور فقہا نے برابر اپنے وقتوں میں اُن مسائل اور عملی مشکلات سے تعرض کیا جو ان کے سامنے آئیں۔(۶۴) آج جبکہ مسائل روز بروز بڑھتے اور مختلف ہوتے جاتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت و اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا فقہ کی جدید تدوین اسی طبقے کی آواز ہے تاکہ وہ مسائل جو اسلامی شریعت کی روشنی میں حل طلب ہیں اُن کا حل اسلامی نقطہءِ نظر سے تلاش کیا جائے۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف مولانا اکبرآبادی نے اشارہ کیا ہے اور اپنا تعلق اسی ترقی پسند علماء کی جماعت سے قرار دیا۔

دوسری بات مذکورہ مطالعہ سے ہمیں جو نظر آتی ہے، وہ مولانا کے فقہی خیالات میں اعتدال و توازن ہے۔آپ نے اختلافی مسائل و فقہیات میں وسعت و رواداری، اعتدال کا راستہ اختیار کیا اور کسی ایک فقہ پر جمود و اصرار کرنے کے بجائے بلا امتیاز تمام فقہی مکاتب سے استفادہ کیا۔ آپ کا یہی وہ مسلک توسُّع تھا جس کی وجہ سے وہ ہر اُس دعوت وتحریک کی حوصلہ افزائی فرماتے، جس میں فقہی رواداری ہوتی اور اس کی بنیاد کسی ایک فقہ پر جمود کی بجائے بلا امتیاز تمام فقہی ذخیروں سے استفادہ پر ہوتی۔(۶۵)

اگرچہ مولانا اکبرآبادی خود حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے مگر انہوں نے دوسرے مسالک کے لیے غیر معمولی فراخ دلی کا اظہار اور احترام کیا۔ یہ خصوصیت ہمیں آج کل کے علماء میں بہت کم نظر آتی ہے۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ مذہبی علماء اور اسکالرز اپنے مسلک و افکار میں بے لچک ہوتے ہیں اور اپنے مکاتبِ فکر کے مقابلے میں کوئی سمجھوتہ قبول نہیں کرتے جبکہ مولانا کا مسلک اس کے بالکل برعکس ہے۔

نیز مذکورہ مطالعے میں آپ کے نزدیک فقہی اقوال و آراء کے مقابلے میں نصوصِ قرآن کو جو برتری حاصل ہے وہ بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے مختلف اُمور و مسائل میں قرآن و حدیث سے براہِ راست استفادہ کیا، بجائے اس کے کہ حنفی مسلک کے مسلمہ اُصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہو۔ اس کی تائید ہمیں مولانا کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک کوئی چیز قدیم ہو یا جدید اُس کے حسن و قبح کا واحد معیار اسلام کی تعلیمات اور اسوۂ نبویﷺ ہیں، جو پوری طرح یا جزاً اس کسوٹی

۶۴- **مسئلہ اجتہاد**، حوالہ سابقہ، ص ۲۰۹

۶۵- **مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم علمی تبحر، اعتدال اور فقہی توسُّع کی حامل شخصیت**، حوالہ سابقہ ص ۳۵۱

پر پوری اُترے گی میں اسے قبول کر لوں گا ور نہ رد کر دوں گا۔ (۶۶)

مختصراً یہ کہ مذکو رہ بالا مطالعے کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقہی معاملات میں آپ نے جو معتدل اور توازن اسلوب اختیار کیا، اس کا بنیادی طریقہ ہمیں ہندو پاکستان میں شاہ ولی اللہؒ کے ہاں نظر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے بھی فقہی مسالک میں کسی ایک مسلک پر شدت اختیار کرنے کے بجائے مختلف فقہی مسالک سے استفادہ کیا اور یہی اسلوب اور طریقہ فقہی مسائل میں مولانا اکبر احمد آبادی کی تحریروں میں نمایاں ہے اور جس کا تعلق درحقیقت ہندوستان میں فقہی اختلافات کے باعث گروہ بندی اور انتشار سے تھا۔ جس نے مسلمانانِ ہند کی وحدت اور یک جہتی پر کاری ضرب لگائی تھی اور یہی ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی اور سیاسی زوال کا سبب ہے۔ غرض مولانا نے جس فقہی مسلک کو اختیار کیا اس کی بنیاد اتحاد اور یک جہتی پر تھی، جس کا مقصد مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنا تھا۔

❁❁❁❁❁

۶۶- سعید احمد اکبر آبادی، **سفر نامہ پاکستان**، مشمولہ: **بُرہان**، جلد ۷۹، شمارہ ۱ (جولائی ۱۹۷۷ء) ص ۱۴